مگر ظاہر ہے کہ ان کو سفر میں بھی وطن کی یاد برابر آتی رہی ہوگی :-

بیہودہ از غم از دلِ من دور می شوی ؛ خواہی نمود یادِ وطن می شناسمت

رفیع، عبدالعزیز خان کی بہن کے شوہر تھے، کہا جاتا ہے کہ جب عبدالعزیز بادشاہ ہوا تو اس نے شاہجہاں سے خواہش کی کہ اس کی بہن کو اس کے پاس بھیجدیا جائے اور اس کی فرمائش کے مطابق اس کی بہن کو اس کے پاس بھیج دیا گیا۔

شاہجہاں کے علاوہ رفیع داراشکوہ[1] کے بھی مداح تھے، اورنگ زیب[2] کے عہد حکومت میں اُن کو "دیوان بیوتات" بنا دیا گیا تھا۔ آخر عمر میں رفیع شاہجہاں آباد میں گوشہ نشین ہو کر زندگی بسر کرنے لگے، مگر حکومت کی طرف سے ان کو وظیفہ ملتا رہا۔ ۱۱۰۰ھ / ۸۹-۱۶۸۸ء میں انھوں نے اس جہانِ فانی سے انتقال کیا۔

رفیع فطرتاً ایک وسیع المشرب اور حلیم انسان تھے :-

زاہد بنشیں کہ تیغِ اسلام ؛ محتاج بہ قتلِ برہمن نیست

اس کے ساتھ وہ ایک مذہبی اور پاکیزہ انسان اور سچے مسلمان بھی تھے :-

اسلام چوں تو یست درو چنگ زن رفیع ؛ کافر مشو کہ رشتۂ زنّار نازک است

البتہ انھیں معلوم تھا کہ گندم نما جو فروش لوگ بھی ہوتے ہیں جو مذہب کے پردہ میں لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں :-

نیست شہری کہ در و صومعۂ نیست رفیع ؛ کہ غرض زہد فروش است دکان بسیار است

وہ شراب سے پرہیز کرتے اور کسبِ حلال کا خیال رکھتے تھے :-

مے مخور خونِ دل بنوش رفیع ؛ بہرِ رزقِ حلال کاسب باش

نیز وہ جائزہ کے لئے کسی کی مدح کرنا پسند نہیں کرتے تھے، پھر بھی توقع کرتے تھے کہ ان کے کلام کو دیکھ کر لوگ ان کی ہمت افزائی کریں گے :-

گر بخت مددگار شود جایزہ یابی ؛ بی مدح اگر در پئ اخذِ صلہ باشی

---

[1] وفات: ۱۰۶۹ ہجری / ۵۹-۱۶۵۸ عیسوی۔
[2] ۱۰۶۸ - ۱۱۱۸ ہجری - ۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ عیسوی۔

وہ دشمنوں کے مقابلہ میں زیادہ تر خاموشی اختیار کرتے تھے :-

خصم از تغافلت ہمہ تن آب شد رفیع ؛ خاموشئ تو ہم سخنِ جانگداز بود

رفیع نظم اور نثر دونوں میں مہارت رکھتے تھے اور درباری لوگ ان سے رشک کیا کرتے تھے، ایک دن حاجی محمد زمان نے اشارۃً شاہجہاں سے کہا کہ رفیع نثار نہیں ہیں صرف شاعر ہیں، قلعۂ شاہجہان کے باغ "حیات بخش" کی تعریف میں انھوں نے ایک مثنوی کہی تھی جس کے اس شعر پر جہاں آرا[1] نے انھیں پانچسو روپیہ انعام دیا تھا :-

انار دل کش آں تازہ بستان ؛ بود پیدانہ ہمچوں نار پستان

مؤلف "باغ معانی" کہتا ہے " زبانش در نہایت لطافت و تازگی و کلامش بسیار بسلاست و نازکی واقع شدہ، تلاشِ مضامین تازہ بسیار دارد و خیلی رنگین خیال شیریں مقال است، در نثر نیز دستگاہی علیا داشت"[2] اور صاحبِ نشترِ عشق لکھتا ہے :

" پایۂ کلامش رفیع المقام است و رتبۂ سخن سنجیش مقبول خاص و عام، در نثاری و دیگر علوم بنہایت قدرت داشت"[3] نیز ان کے ان اشعار کو نقل کیا ہے :-

ما قوتِ پرواز نداریم وگرنہ ؛ عمریست کہ صیاد شکست است قفس را

نہ فریب وعدہ ماندہ نہ امید وصل ہمدم ؛ بچہ حیلہ روز سازم شبِ انتظارِ خود را

مؤلف " نتائج الافکار" ان کو " ناظم رفیع القدر منشی خوش رقم"[4] کہتا ہے۔

اور محمد صالح کنبوہ کہتا ہے کہ :

" طبعش چوں موسم گل روانست و فکرش مانند بہار رنگین و گل افشان، قلمش بتحریر اشعار رنگین زمین سخن را رشک چمن می کند"[5]

تذکرۂ ہمیشہ بہار اور کلیات الشعراء میں ہے کہ رفیع اپنے اس شعر پر فخر کیا کرتے تھے :-

عمر گر خوش گذرد زندگی خضر کم است ؛ ور بنا خوش گذرد نیم نفس بسیار است

---

[1] ۱۰۲۳ - ۱۰۹۲ ہجری / ۱۶۱۴ - ۱۶۸۰ عیسوی
[2] ورق ۱۲۰ [3] ورق ۴۷ [4] ص ۲۷۰ [5] ج ۳ ص ۴۱۴

مرزا معز[1] نے اس پر اعتراض کیا کہ "بناخوش" غلط ہے، اس کو "ناخوش" یا "بناخوشی" ہونا چاہئے، رفیع نے اس کو "بتلخی گذرد" کر دیا، مگر پھر شعر کا مزہ ہی جاتا رہا۔

عام شعراء کی طرح رفیع کو بھی اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا:-

باچون منی شریک مداں خویش را رفیع ؛ مگذر ز حق بگوی کہ صاحب سخن یکیست
مگر رفیع کہ داری کلامِ سحر آمیز ؛ بلے بگو کہ بنظمِ تو سحر مانند است

وہ اپنے اشعار میں حاسدوں اور رقیبوں کا مقابلہ کرتے رہتے تھے:-

درمیان است سخن قدرتِ خود را بنمائی ؛ مدعی گو تو غزل را بہ ازیں می گوئی

اور ان کو یہ شکایت تھی کہ لوگوں کی کم ظرفی کی وجہ سے ان کا ہنر اچھی طرح اُجاگر نہ ہو سکا:-

بافضل و کرم گرمیٔ بازار ندارم ؛ خود را چہ فروشم کہ خریدار ندارم

شعراء میں سے رفیع نے فغانی[2] اور صائب[3] کی مدح سرائی کی ہے:-

رفیع اظہارِ شاگردی کند پیشِ سخن سنجی ؛ کہ در طرزِ سخن استاد میداند فغانی را
بسخنہائے تازہ راغب باش ؛ راست رو ہمچو فکرِ صائب باش

کلیاتِ مرزا حسن بیگ رفیع کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے (نمبر ۱۶۰۳) جس کے شروع میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:-

"کلیاتِ مرزا حسن سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچارڈ جانسن صاحب بہادر دام اقبالہ"

یہ نسخہ غزلیات سے شروع ہوتا ہے اور پہلا شعر یہ ہے:-

نالم..... از خوبی آرائشِ دیوانہا ؛ زین نام بہر عنواں ظاہر شدہ فرمانہا

اس میں غزلوں کا حصہ بیچ سے ناقص ہو گیا ہے، بہر حال اس حصہ کے اشعار ۶۵۰۰ سے زائد ہی ہونگے، رفیع ایک متوسط درجہ کے شاعر ہیں، اور عام طور سے ان کے اشعار اوسط درجہ کے ہوتے ہیں،

---

[1] معزالدین محمد موسوی خاں متخلص بہ فطرت و موسوی متوفی بسال ۱۱۰۱ ہجری / ۹۰-۱۶۸۹ عیسوی۔
[2] وفات ۹۲۵ ہجری / ۱۵۱۹ عیسوی [3] وفات ۱۰۸۸ ہجری / ۱۶۷۷ عیسوی۔

البتہ مندرجہ ذیل جیسے اشعار میں، جیسا کہ مؤلف نشترِ عشق نے لکھا ہے، لطافت، تازگی، سلاست، نازکی، رنگین خیالی اور شیرینی بخوبی پائی جاتی ہے :۔

راہ مدہ بہ بزمِ خود شمع برہنہ پای را ÷ کیست کہ پیش چوں توئی آید و سرکشی کند
شرمندۂ خورشید رخت زہرہ جبینہا ÷ ای کفر ہمہ زلفِ تو آرائش دینہا
زلفِ خود را گردہ چوں سنبل پریشان ازکجا ÷ باز پیدا شد نگارم مست و جولاں ازکجا
خود ہیچ درختی نفروشد برِ خود را ÷ از دانشِ خود صاحبِ معنی نزند دم
برزلفِ تو بنیاد پریشانئ دلہا ÷ ای عشقِ تو خوشنود ز ویرانئ دلہا
لحظۂ بود آشنائیہا ÷ دیدم از یار بے وفائیہا
خوں در جگرِ مشکِ ختن می کنم امشب ÷ از ہندوِ زلفِ تو سخن می کنم امشب
صد ناز بمرغانِ چمن می کنم امشب ÷ تا قصۂ رخسارِ تو گویم بگلستاں
تعریف خزاں شنیدنی داشت ÷ فریاد کہ گوشِ گل گران است
لعل لبِ او گزیدنی داشت ÷ چون نامِ رقیب برزباں راند
از میکدہ بیروں بچہ تقصیر تواں رفت ÷ نے توبہ نمودیم نہ پیمانہ شکستیم
میکشاں را از گل و مل کام می باید گرفت ÷ بوسہ از ساقی شراب از جام می باید گرفت
از چہ دانیم کہ زاہد بخدا نزدیک است ÷ برہمن بت بہ بغل دارد و خود می بینم
دستِ مرا کدام مسلماں گرفتہ است ÷ افتادہ ام چہ شد کہ برہمن طلب کنم
ساقی دگر طبیعتِ دوراں گرفتہ است ÷ جامی ز التفات نمی بخشدم رفیع
دل را گماں کہ گوش بر افسانۂ من است ÷ من گرم حرفم و نظر او بدیگریست
این چنیں گر رو نماید عشرتِ دنیا خوش است ÷ یار ساقی بادہ باقی بزم خالی از رقیب
کہ جواب نامۂ من بکجا رسیدہ باشد ÷ ز برم نرفتہ قاصد ز کمالِ شوق پرسم
زکدام راہ زاہد بخدا رسیدہ باشد ÷ ز درونِ خلوتِ خود نہادہ پای بیروں

ما توبه را شکستیم چون باده را ندیدیم ∴ از زاہدان نپرسید ایشان چه کار کردند

از بس ہجوم بر سرِ کویش ز عاشقان ∴ ہر مشتِ خاکِ او وطنِ صد غریب شد

تا دیدهٔ شوقم ز جمالِ تو جدا شد ∴ عیشِ دلِ من تنگ تر از چشمِ گدا شد

زیبا منشین سراپای جہان گردیدنی دارد ∴ اگر مسجد و گر دیر است ہر یک دیدنی دارد

ہر کجا صحبتِ خورشید جمالان شده گرم ∴ ذرّہا نیز جدا انجمنی ساخته اند

ای بحر چه نازی بصفای گہرِ خویش ∴ این قطرهٔ آبیست که ہر آبله دارد

گشتیم جدا از ہمه بیگانه شد آخر ∴ عشقِ من و او بازیٔ طفلانه شد آخر

ہمه یاس و تمام نومیدی ∴ قاصدِ بے جواب را مانم

روشناسِ جہان شدم چو رفیع ∴ عارضِ بے نقاب را مانم

دراں نه قطرهٔ اشکے دریں نه لختِ دلی ∴ دلم خوش است که دامان و آستین دارم

سنگ در ہنگامهٔ صد آرزو انداختیم ∴ رخنہا بسیار در جام و سبو انداختیم

رخ نکو چشمت نکو زلفت نکو حالت نکو ∴ راستی قد ہم نکو اما فغاں از خوی تو

نه محبتی نه دردی نه غمی ازیں چه حاصل ∴ که چو صبح آه سردی بعبث کشیده باشی

بگماں شکوه از من چه دلِ رمیده باشی ∴ گله که من نکردم تو کجا شنیده باشی

مگر ان کے مقابلہ میں بہت سے ایسے شعر بھی ملتے ہیں جو لفظ و معنی کے لحاظ سے حد عادی سے پائیں تر ہیں۔ نیز ان میں تصنع، سستی اور غیر شاعرانہ معنی آفرینی کا رنگ ملتا ہے:؎

یک رنگی جہان ز دمِ صبح ظاہر است ∴ در بیضهٔ سپہر بغیر از سفیده نیست

قفلِ وسواس تو زاہد از کجا خواہد کشود ∴ گر دلِ تنگ کلیدش در درونِ خانه ماند

ز لطفِ بے محل آسمان عجب نبود ∴ اگر بگورِ پس از مرگِ او عصا بدہد

نادان باہلِ معنی خواہد ضرر رساند ∴ اندیشه ندارد کرم از کتاب خوردن

عینک کا لفظ غزل کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا، مگر اس زمانہ میں اس کا ایسا رواج ہو گیا تھا کہ

اس کو طرح طرح سے باندھا گیا ہے، رفیع کہتے ہیں :-

ہر کراشد مصحفِ روی تو غائب از نظر ÷ ہمچو عینک ہر دو چشم خویش را بر ہم نہاد

غزلیات کے بعد رباعیات (۷۷ عدد) کی باری آتی ہے، ایک رباعی میں غالباً شاہ جہان کی مدح اور دوسری میں اپنے کو ہند کا عرفی بتا کر حکیم ابوالفتح گیلانی[1] اور عبدالرحیم خانخانان[2] اور ان کی فیاضی کو یاد کیا ہے :-

من عرفی ہند مرد احسانش کو ÷ خانی کہ تواں بر درزر از خوانش کو

در عرصۂ حکیم عہد ابوالفتحش کیست ÷ خان بسیار اند خانخانانش کو

ذیل کی رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ایرانیوں اور ہندیوں کی الگ الگ گروہ بندی رہتی تھی اور اہلِ ہند ایرانیوں کے تفوق کے قائل نہ تھے :-

در کشورِ ہند نکتہ گیراں ہستند ÷ در قصد شکست اہلِ ایراں ہستند

گر زیر و زبر شدند جمعی زمیاں ÷ چوں نکتۂ شک کنارہ گیراں ہستند

آخر میں چھوٹی چھوٹی مثنویوں کی باری آتی ہے اُن میں پہلی مثنوی (۳۵۴ بیت) شاہجہاں کی مدح میں ہے اور اس بیت سے شروع ہوتی ہے :-

قلم تا کرد بالوح آشنائی ÷ سخن در ...... بود از نا روائی

اس میں شاہجہان کے باغ "حیات بخش" حمام، عمارتوں اور درباری معماروں اور مصوروں کی بیجد تعریف کی گئی ہے :-

یکی در عالم تعمیر کامل ÷ کہ می آورد جاں در قالبِ گل

یکی در شیوۂ تصویر استاد ÷ کہ بودی دالہ او روحِ بہزاد

---

[1] وفات ۹۹۹ ہجری/ ۹۱-۱۵۹۰ عیسوی [2] وفات ۹۹۷ ہجری/ ۱۵۸۹ عیسوی

[3] ۹۶۴ – ۱۰۳۶ ہجری/ ۱۵۵۶ — ۱۶۲۷ عیسوی –

اس کے آخر میں شاعر نے ایک اچھے گھوڑے کی تعریف اور ایک خراب گھوڑے کی مذمت بھی کی ہے:۔

مرا اسپیست سست و زار و لاغر ❊ چو تارِ عنکبوت از پای تا سر

دوسری مثنوی (۴۸ بیت) میں کسی شخص کی ہجو کی گئی ہے:۔

اے چو سر پوش آش .... با سرِ کوچک و دہانِ بزرگ

نیستی گرچہ صاحب سفرہ ہمچو آشِ مصاحب سفرہ

پیرِ و آش و ہمدم نانی طبق زیرِ کاسہ را مانی

تیسری مثنوی (۳۳۴ بیت) میں بھی شاہجہاں، اس کی مسجد، قصر، برج، دربارِ عام، دربارِ خاص، تختِ مرصع، حمام، باغ اور عید وزن کا ذکر کیا گیا ہے۔

فہرست منابع

حسین قلی خاں عظیم آبادی : نشترِ عشق، نسخہ خطی شمارہ ۷۱۶، X
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

نقش علی : باغ معانی، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۸،
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

کشن چند اخلاص : ہمیشہ بہار، نسخہ خطی شمارہ ۶۸۹،
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

قدرت اللہ گوپاموی : نتائج الافکار، چاپخانۂ سلطانی، بمبئی

محمد صالح کنبوہ : عمل صالح، محمود پرنٹنگ پریس، لاہور

محمد افضل سرخوش : کلمات الشعراء، دین محمدی پریس، لاہور۔

HERMON ETHI CATLELOGE OF PERBIAN MAUNISCRIPT IN THE LIBRARY OF THE INDIA OFFICE CLARENDON, PRESS. OXFORD

قسط چہاردہم[۱۴] :-

میر کا سیاسی اور سماجی ماحول

جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

گذشتہ سے پیوستہ

کان کا موتی

دیکھی تھی ترے کان کے موتی کی اک جھپک ؛ جاتی نہیں ہے اشک کے رخسار کی ڈھلک

موتی کی لڑی

جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے ؛ ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

زنجیر اور توڑا

ہو کے دیوانے ہم ہوئے زنجیر ؛ دیکھ کر اُس کے پاؤں کا توڑا

کڑے

آ کڑوں کی پاؤں میں بیڑی ہوئی ؛ ہاتھ میں سونے کی وہ زنجیر یار

بلاق

دم ناک میں بقولِ زناں عاشقوں کا ہے ؛ ہلنا بلا ہے موتی کا اس کے بُلاق میں

بالیاں

خیروں (؟) نے ریختہ کو دوں ریختہ بنایا ؛ جوں ان دنوں میں بالے لڑکوں کی بالیاں ہیں

کان کا گوہر

گر پڑیں گے ٹوٹ کر اکثر ستارے چرخ سے ؛ ہل گیا جو صبح کو گوہر کسی کے کان کا

بالا

لگنے نہ دے بس ہو تو اُس کے گوہرِ گوش کو بالے تک ؛ اس فلکِ چشم، مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے[۱]

---

۱ مندرجہ بالا زیورات کے علاوہ دیگر اقسام کے زیورات کے لئے ملاحظہ ہو۔ مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی
ص ۲۴-۲۶-۳۱-۵۰-۵۶-۶۸-۶۹-۸۲-۱۵۵-۱۵۸-

سنگار اور آرائش

ابوالفضل کا بیان ہے کہ عورت کے سنگار سولہ[۱۶] ہیں۔ غسل کرنا، تیل ملنا، چوٹی گوندھنا، تالو کو زیور سے آراستہ کرنا۔ چندن کا لیپ کرنا، لباس پہننا، (اور یہ لباس طرح طرح کا ہوتا ہے بعض کی آستین انگلیوں تک اور بعض کہنیوں تک ہوتی ہیں) قشقہ لگانا۔ کاجل کو سُرمہ کی طرح استعمال کرنا۔ بندے پہننا ناک میں سونا اور موتی پہننا، گلے میں زیور، پھول یا موتی کا مالا پہننا، ہاتھوں میں مہندی ملنا۔ کمر بند۔ پاؤں میں سونا پہننا، پان کھانا، نازو ادا کے حرکات۔[۱]

ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی سنگار کی بہت شائق تھیں۔ اکثر وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو مہندی لگاتی تھیں[۲]۔ آنکھوں میں کاجل یا سرمہ اور دانتوں میں مسی لگاتی تھیں۔ کاجل اور مسّی کا رواج مَردوں میں بھی تھا۔ ہونٹوں کو سُرخ کرنے کی خواہش کی وجہ سے عورتوں میں پان کھانے کا عام رواج تھا۔[۳] چہرے پر ملنے کے لئے غازہ کا استعمال کیا جاتا تھا۔[۴]

بالوں کے سنوارنے کا مسلمان عورتیں بالخصوص اہتمام کرتی تھیں، بالوں کو چوٹی یا جوڑے کی شکل میں گوندھا جاتا تھا۔ جوڑہ کے ساتھ وہ ایک سنہری پٹی باندھتی تھیں جسے سرباف کہتے تھے[۵]۔ پھولے کے ہار بھی گلے میں ڈالنے کا رواج تھا۔ عطر اور پھول سماجی حیثیت کے موافق ضرور استعمال کئے جاتے تھے،

آنندرام مخلص نے لکھا ہے کہ عورتیں ایک قسم کی چیز بناتی تھیں جس سے اپنے ماتھے اور بھنویں مزیّن کرتی تھیں۔

خوشبوؤں میں ارگجا عام طور سے استعمال ہوتا تھا اور یہ ایک قسم کی مرکب خوشبو تھی، جس سے استقبال بھی کیا جاتا تھا، مخلص کا شعر ہے :-

دھوم آنے کی کس کے گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

---

[۱] آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج ۲۔ ص ۲۸۲ تا ۲۸۳ [۲] برائے تفصیل۔ منوچی، ج ۲۔ ص ۳۴۱، ۳۴۰۔
[۳] اٹھارھویں صدی کے لٹریچر میں اس سلسلے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ [۴] کلیاتِ قاسم۔
وہاں غازہ ملنا ہے یاں ہے شانہ کرنا ÷ بناوٹ کے ایسے بہانے بہت ہیں۔ ص ۳۸۹
[۵] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مجموعہ مثنویات میرحسن دہلوی۔ ص ۶۱ - ۶۴ -